© rasailojaraid.com

ڈاکٹر شفیق عجمی

اقبال کا تصورِ ارتقاء

پروفیسر شاہد حسین کی پسِ مرگ شائع ہونے والی کتاب ''فلسفیانہ مضامین'' کے مضامین ''تشخص ذات سے پس جدیدیت'' کے عنوان کے تحت مختلف اوقات میں لکھے گئے جنھیں وفات سے قبل وہ مرتب کر چکے تھے، حتیٰ کہ ٹھیک ایک سال قبل وہ اس کا دیباچہ اور اظہارِ تشکر بھی تحریر کر چکے تھے لیکن کتاب کی اشاعت ان کی زندگی میں ممکن نہ ہوسکی۔

20 نومبر 1937ء کو پیدا ہونے والے پروفیسر شاہد حسین کا شمار بھی ان ممتاز لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی اور پھر اپنی مادرِ علمی میں عمر عزیز درس و تدریس میں گزاری۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر حمید الدین، پروفیسر سعید شیخ، ڈاکٹر اجمل اور دیگر نامور ماہرین تعلیم شامل تھے۔

انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور کے بعد لنکاسٹر یونیورسٹی (برطانیہ) سے بھی فلسفہ میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی مادرِ علمی میں وہ پروفیسر (فلسفہ)، صدر شعبۂ فلسفہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈین آف آرٹس کے عہدوں پر فائز رہے۔ انھیں شعبۂ فلسفہ کے ریسرچ جرنل The Quest کے بانی ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

زیر نظر مجموعے میں شامل مضامین متنوع فلسفیانہ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن میں تشخص ذات کے بحران سے مارکسزم اور وجودیت جیسی تحریکیں شامل ہیں۔ پروفیسر شاہد حسین سے راقم کا غائبانہ تعارف 1988ء کے وسط میں اس وقت ہوا جب ایم۔اے فلسفہ کے امتحان کے آخری مرحلے میں زبانی امتحان (Viva Voce) کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا اور دیگر طالب علموں کو یہ دعا کرتے ہوئے سن رہا تھا کہ شاہد حسین صاحب اس Viva میں شریک نہ ہوں۔ میرے استفسار پر ایک طالب علم نے بتایا کہ وہ بہت سخت ہیں اور انٹرویوز وغیرہ میں کسی رعایت کے قائل نہیں ہیں۔ طالب علموں کی دعائیں قبول ہوئیں۔ شاہد صاحب کسی وجہ سے پہنچ نہ سکے اور Viva صرف پروفیسر سی۔اے قادر (Chaudhary Abdul Qadir) اور ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے Conduct کیا۔ دونوں ہی بہت مہربان اور شفیق استاد تھے۔ بدقسمتی سے انٹرویو کے کچھ دنوں کے بعد پروفیسر قادر کا اچانک انتقال ہوگیا تو یار لوگوں نے اس کا ذمہ دار راقم کو ٹھہراتے ہوئے کہا کہ دراصل وہ تمہارے انٹرویو کی تاب نہیں لا سکے۔

شاہد حسین صاحب سے میرا غائبانہ تعارف خاصا جابرانہ قسم کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1996ء میں جب راقم نے گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اردو کو Join کیا تو پروفیسر صاحب کو اکثر اپنے آفس کی طرف کبھی جاتے اور کبھی وہاں سے نکلتے دیکھا لیکن نہ ان سے کبھی ملنے کی نوبت آئی نہ ہی گفتگو کی جرأت ہوئی۔ یہ سب اسی تعارف کا کیا دھرا تھا۔

پروفیسر مرحوم اپنی ملازمت کے آخری سالوں میں گورنمنٹ کالج لاہور کی Principalship کے حوالے سے کچھ مقدمہ بازی میں بھی الجھے رہے جس میں ان کو کامیابی تو حاصل نہ ہوئی لیکن وہ اپنے موقف پر آخر تک سختی سے ڈٹے رہے۔ پروفیسر شاہد حسین کی زیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بحث کتاب مجھے یار مہربان پروفیسر اعظم خان کے توسط سے حاصل ہوئی جو شعبۂ فلسفہ کے موجودہ چیئر پرسن ہیں اور جنھیں پروفیسر شاہد کے ہونہار شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

اٹھارہ مضامین کے اس مجموعے کا انتساب انھوں نے اپنے طالب علموں کے نام کیا ہے۔ اس مجموعے کے درج ذیل چند مضامین بالخصوص میری دلچسپی کا مرکز ہیں اور ان پر کچھ نہ کچھ Comment الگ سے کسی مضمون میں کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

1. Iqbal on Personal Identity
2. Iqbal's View of Evolution
3. Is Marxism a Philosophy?

اپنے فلسفیانہ مضامین کے بارے میں پروفیسر شاہد حسین کا کہنا تھا کہ عصرِ حاضر کی ہنگامہ خیزی اور شورش میں گھرے ہوئے انسان کو جس مسئلے کا سامنا ہے وہ آشوب ذات کا مسئلہ ہے۔ انسان جو ہمیشہ سے مصائب، آلام، تنہائی، غربت اور خوف مرگ میں مبتلا رہا ہے اور جس کی بھاری قیمت اس کو اپنی ذات کی نفی اور بیگانگی کی صورت میں ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ سیارہ زمین پر تمام تر سائنسی اور تکنیکی ترقی اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی عیش اور آسائش کے باوجود اس زمین پر بسنے والا انسان:

Sad

Bad اور

Mad Man

کی صورت بنا کھڑا ہے۔ اس کی یاسیت، منفیت اور وحشت کا علاج آخر کیا ہے؟ اس کی جستجو کی جانی چاہیے جو یقیناً تشخص ذات کی بحالی کی صورت میں ممکن ہے۔ اس اہم انسانی مسئلہ کو پروفیسر شاہد صاحب نے فلسفے کے سنجیدہ طالب علموں کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس اُمید کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنی توجہ اور فکر سے اس کے حل کی سعی کریں گے۔ (دیباچہ، فلسفیانہ مضامین)

مصنف کے معاصر فلسفہ دانوں، ڈاکٹر عبدالخالق، ڈاکٹر نعیم احمد اور ڈاکٹر غزالہ عرفان کی آراء کو بھی کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے جن کے مطابق پروفیسر شاہد حسین لفظوں کو ضائع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیے بغیر اپنا مدعا کمال خوبی کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے قاری کو اس کی تفہیم میں کسی دشواری کا سامنا بھی کرنا نہیں پڑتا۔ یہ مہارت آج کے لکھنے والوں میں بہت کم نظر آتی ہے۔ پروفیسر شاہد کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کی تحقیق ہمیشہ بنیادی اور مستند مصادر پر استوار ہوتی ہے اور اس کا ثبوت ان کے حواشی و حوالہ جات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی ہو جاتا ہے۔ (ڈاکٹر عبدالخالق)

پروفیسر شاہد حسین کے فلسفیانہ مضامین ان کی جستجوئے علمی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں اور یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ عدل، مارکسیت، تشخص ذات، پس جدیدیت اور دیگر موضوعات پر لکھے گئے مضامین سے ہر سطح کا قاری مستفید ہوسکتا ہے۔ (ڈاکٹر نعیم احمد)

فلسفیانہ مباحث میں فرد کے تصور کو جو اہمیت دی جاتی ہے اس کے پیش نظر پروفیسر شاہد نے اپنے مضامین میں مشرقی اور مغربی فلسفیوں کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے۔ برصغیر میں سے انھوں نے اس ضمن میں اقبال کے تصورات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ لیکن ایک سچے فلسفی کی طرح وہ ان فلسفیانہ سوالات کا کوئی حتمی جواب فراہم کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ فلسفہ حیات و کائنات کے باب میں سوالات ضرور اُٹھاتا ہے لیکن ان کے یقینی جوابات تک پہنچنا فلسفہ کے منصب کا تقاضا نہیں کیونکہ فلسفہ دانش کی مسلسل جستجو سے عبارت ہے اور یہ سفر کہیں ختم نہیں ہوتا۔ لہٰذا پروفیسر شاہد فکر و دانش کا سفر جاری رکھنے کے حامی ہیں اور بظاہر جسے ایک خامی تصور کیا جاتا ہے وہی فلسفے کی ایک لازمی امتیازی خصوصیت بن جاتی ہے۔ (ڈاکٹر غزالہ عرفان)

زیر بحث مجموعے پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ موضوعات نصاب فلسفہ کا حصہ ہیں اور اس طرح سے پروفیسر شاہد ان پر کمال دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً ان کو Update کرتے ہوئے نئے حوالوں سے اُن کو مزین بھی کیا ہے۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ انھوں نے اپنے مضامین میں اقبال کے بعض تصورات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی Discuss کیا ہے لیکن کتاب کے آخر میں دی گئی منتخب کتابیات (Selected Bibliography) میں اقبال کی تصانیف خصوصاً Reconstruction of Religious Thought in Islam کا اندراج نہیں کیا، جس کے کئی بار حوالے آئے ہیں، اور یہ کمی طریق تحقیق کے منافی ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ مضامین اپنی فکر انگیزی کی بدولت دوبارہ طباعت کے مراحل سے گزرے گا، اس صورت میں اس کی مذکورہ بالا خامی کا ازالہ بھی یقیناً ہوسکے گا تاکہ اس کا جدید ایڈیشن پہلے سے بہتر اور مکمل ثابت ہو۔ ذیل میں اقبال کے تصور ارتقا کے موضوع پر پروفیسر شاہد حسین کے ایک مضمون کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

چارلس ڈارون (Charles Darwin) نے اپنی تحقیقات ارتقا میں بالخصوص خدا اور تصور مذہب کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کیا لیکن اس کے باوجود مروجہ عقائد متزلزل ضرور ہوئے۔ صدیوں سے رائج تخلیق کا مقدس تصور بھی اس سے متاثر نظر آیا۔ ڈارون کے تحقیقی مفروضات ونتائج، ممکن ہے کہ مسلمات کا درجہ حاصل کرلیتے، اگر لیمارک (Lamarck)، مورگن (Morgan) اور برگساں (Bergson) نے اس کے تصور پر کاری ضرب نہ لگائی ہوتی۔ انھوں نے ڈراونی تصور کے تضادات کو واضح کرکے بحث کا رُخ ایک بار پھر مذہبی تصور کائنات کے حق میں موڑ دیا۔

ڈارون کے برعکس اقبال نے خدا کا تصور ایک ایسی حقیقت کے طور پر پیش کیا جو ظاہر و باطن، ابتدا و انتہا اور اول و آخر کی صفات سے متصف ہے۔ وہ خدا کے شخصی تصور کے ساتھ ساتھ اس کے ماورائی تصور کو بھی اپنے افکار کا حصہ بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تصور ارتقا میں قرآنی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ارتقا کے حوالے سے جدید رجحانات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اقبال کا تصور ارتقا حقیقی معنوں میں اس کے ذاتی تصورات کی اساس پر قائم ہے۔

اقبال کی رائے میں حقیقت کائنات ایک ایسی وحدت ہے جس نے کائنات کی کثرت میں خود کو ظاہر کیا ہے، لہٰذا تمام تر حیاتیاتی سرگرمی کا رُخ اپنی اصل کی طرف ہے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس ہستی اور قوت کا سرچشمہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عرض اور جوہر محض ہستی ہی کی صورتیں ہیں جو حصول کمال کے سفر میں کبھی وحدت اور کبھی کثرت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ہستی کے ان متنوع پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ گویا شعلے نے خود کو شراروں میں تقسیم کیا ہے:

شعلۂ خود در شرر تقسیم کرد
جز پرستی عقل را تعلیم کرد (۱)

یہاں اقبال شاید عقل انسانی کے اس تجزیاتی طریق کی طرف اشارہ کررہے ہیں جو اشیاء اور مظاہر کو ایک وحدت کے طور پر دیکھنے کی بجائے اس کا جزیاتی مطالعہ پر اصرار کرتا ہے۔ لیکن اگر اسے درست تصور کرلیا جائے کہ حقیقت مظاہر کے اجزا میں نہیں بلکہ اس کی وحدت میں پنہاں ہے تو پھر عقل کی نارسائی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ اقبال عقلی طریق پر وجدان کو ترجیح دیتے ہیں جس کے ذریعے سے مظاہر کی وحدت تک رسائی ممکن ہے۔

اقبال کے نزدیک ارتقا کی قوتِ محرکہ مظاہر کا حرکی میلان ہے جو اپنی اصل وحدت کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ ان کی رائے میں مظہریاتی عمل ہی دراصل بنیادی وحدت اور اس کے کثرت میں تبدیلی کے شعور کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی لیے وہ علم اور ادراک کے بجائے عمل پر زور دیتے ہیں۔ وہ ہیگل (Hegel) کے برعکس، عقل کے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہیں کہ تخلیقی قوت ہی زندگی کی اصل حقیقت کی نمائندہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مثبت نتائج کے حصول کے لیے تنہا عقل کوئی کردار ادا نہیں کرسکتی بلکہ اس مقصد کے لیے اُسے وجدان کا سہارا بھی درکار ہے:

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زُناریِ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اُس کا طلسم سب خیالی (2)

اقبال کے نزدیک زندگی اپنے وسیع تر امکانات کے انکشاف کے لیے اپنا تضاد خود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی تخلیق کرتی ہے۔ خارجی دنیا کا وجود آزاد نہیں بلکہ اس کے وجود کی نوعیت اشتقاقی ہے۔ ارتقائے حیات سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ابتداء میں مادہ ذہن پر غالب نظر آتا ہے لیکن بتدریج ترقی اور نشوونما کے بعد بالآخر ذہن مادے کو تسخیر کر لیتا ہے اور اس طرح سے اُسے کامل آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

کوئی ایسی شے جسے خالصتاً مادی یا دنیاوی قرار دیا جا سکے، وجود نہیں رکھتی جب تک کہ ہم اس کی بنیاد روحانیت میں تلاش نہ کر لیں۔ اسی لیے اقبال نے بار بار تضادات کی تخلیقی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ شعور اور مادہ باہمدگر مضبوط ہو کر ہی فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک یہ کائنات ان معنوں میں کامل نہیں کہ اس میں تحرک اور تبدیلی کی گنجائش موجود نہیں ہے کیونکہ اس سے زیادہ کوئی تصور قرآنی حکمت کے خلاف نہیں کہ یہ کائنات کسی طے شدہ منصوبے کا زمانی حصہ ہے جو مادے کے ایک بے جان ڈھیر کی طرح مکان مطلق میں پڑا ہے جس پر زمانہ کسی طور پر بھی اثر انداز نہیں ہو رہا۔ (3)

کیونکہ ان کے نزدیک کائنات مسلسل تغیر پذیر ہے (جیسا کہ اسی حقیقت کو شعری اسلوب میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

اور اپنی کنہ میں ایک نئی تخلیق کی بشارت ہے۔ اگر اس کے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع مگر ناتمام کائنات موجود ہے تو پھر انسان اس کائنات کی تکمیل کے عمل میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟ اس ضمن میں اقبال، برگساں کی طرح میکانیت اور جبریت پر یقین نہیں رکھتے کیونکہ جبری میکانیت پر یقین کا سراسر نتیجہ انسانی آزادی اور ارادے سے محرومی اور علت و معلول کی جکڑ بندی پر منتج ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دراصل تخلیقی سرگرمی کے معنی آزاد اور بامقصد سرگرمی کے ہیں۔ تخلیق کے معنی تکرار کی نفی کے ہیں جو حقیقتاً جبریت ہی کی ایک صورت ہے۔ چنانچہ تخلیقی فعالیت یا سرگرمی کو جبریت کے حوالے سے بیان ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ:

> ''اگر کائنات فی الواقعہ کسی ایسی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے جو پہلے سے متعین ہے تو اس میں ارادہ و اختیار کی گنجائش موجود ہے نہ اخلاقی عوامل کی۔ یہ ایک ایسی تماشا گاہ کی مانند ہوگی جہاں کوئی مخفی ہاتھ کٹھ پتلیوں کو نچایا کرتا ہے۔''(4)

وہ جبریت پر مبنی اس تصور کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جس کا طویل عرصہ تک مغربی ذہن اسیر رہا ہے اور جس نے خود شعوری کے تصور کو مفلوج کیے رکھا۔ ان کے نزدیک یہاں متعین مقاصد کے بجائے نئے نئے مقاصد وضع ہوتے رہتے ہیں اور ارتقائے حیات کے ساتھ نئی مثالی اقدار پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا تصور تقدیر بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ یہ کوئی ایسی قوت نہیں جو خارج سے اس کو متاثر کررہی ہے بلکہ یہ شے کی اپنی اندرونی قوت ہے جس کی بدولت امکانات ایک تسلسل کے ساتھ وجود میں آرہے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ہر ذی روح کا مستقبل ایک کھلے امکان کی طرح موجود ہے نہ کہ ایسے متعین واقعات جو مقررہ وقت پر ظہور پذیر ہورہے ہیں۔

حقیقت مطلق کا لمحہ لمحہ بھی حقیقی یا تخلیقی حیثیت رکھتا ہے جو ندرت کو جنم دیتا ہے اور جس کے بارے میں کوئی پیش بینی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی تخلیقی فعالیت کو جبریت کی اصطلاحوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

اقبال کے نزدیک زندگی مسلسل رواں دواں ہے اور نئی آرزوئیں اور نئے مقاصد تخلیق کررہی ہے۔ لہٰذا ایک آزاد خودی ایک نئے مستقبل کی تخلیق کے انکشاف کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم ہر لمحہ ایک نئی شان میں موجود ہوتے ہیں۔ تبدیلی، تغیر اور تکمیل کے عمل سے گزرتے ہیں اور مسلسل تخلیقیت میں سرگرم رہتے ہیں اور وہ بن پاتے ہیں جو ہم ہیں۔ زندگی دراصل موت کے بیچوں بیچ سے گزرے والا ایک باقاعدہ راستہ ہے۔ اقبال کی رائے میں انسانی ارتقا ایک کبھی ختم نہ ہونے والا ایسا مسلسل عمل ہے جس کے دوران انسان اپنی بے پناہ مادی اور ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشتا چلا جاتا ہے۔

وجودیاتی سطح پر اس کا اظہار اس طرح سے کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے عمل پیہم سے ایک فرد کامل کے مرتبے پر فائز ہوسکتا ہے جس کی مدح نطشے (Nietzsehe) جیسا فلسفی بھی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے عہد کے انسان سے بیزار ہے اور فوق البشر کا تصور پیش کرتا ہے، ایک ایسے فوق البشر کا تصور جو ذہنی اور جسمانی طور پر سب پر فائق ہے۔

حوالہ جات

1۔ محمد اقبال، اسرار و رموز، بار سوئم ۱۹۴۸ء، ص ۱۳

2۔ کلیات اقبال (اردو) اسلام آباد نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۵۳۰

3. Muhammad Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam, Ed. M. Saeed Sheikh, lahoer: Institute of Islamic Culture, 1999, p-44

4. ibid p43

© rasailojaraid.com